ناصر عباس نیر کے افسانوں کا موضوعاتی مطالعہ

A Thematic Study of Nasir Abbas Nayyar's Short Stories

عظمیٰ منیر نرمین خان	شعبہ اُردو بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، پاکستان

Abstract: This research paper, titled "A Thematic Study of Nasir Abbas Nayyar's Short Stories," examines the major themes and intellectual dimensions of Nasir Abbas Nayyar's short fiction. He is a prominent contemporary Urdu fiction writer whose stories reflect the complexities of human existence, social injustice, political oppression, cultural decline, and the crisis of identity. Through symbolic expression, philosophical reflection, and psychological insight, Nayyar explores the relationship between individuals and the social systems that shape their thoughts, actions, and experiences. His short stories address significant issues such as the misuse of power, the failure of justice, the erosion of moral values, colonial mentality, human alienation, and the conflict between individual freedom and institutional authority. Stories from his collection Aik Zamana Khatam Hua Hai (2020) illustrate his distinctive approach to representing contemporary social and intellectual challenges. His symbolic treatment of animals, books, memory, death, and human relationships enriches the thematic depth of his fiction. This study adopts a thematic and analytical approach to examine how Nayyar transforms ordinary experiences into broader reflections on society, culture, and human consciousness. It argues that his short stories offer a critical perspective on contemporary life and encourage readers to reconsider established social attitudes, ethical responsibilities, and the meaning of humanity.

Keywords: سماجی ناانصافی، سیاسی جبر، تہذیبی زوال، انسانی نفسیات، شناخت کا بحران، اخلاقی اقدار، انسانی وجود، فکری شعور۔

Email: Uzmam7neer@gmail.com, Narmeenkhan445@gmail.com

ڈاکٹر ناصر عباس نیر اردو ادب کے ممتاز افسانہ نگار، نقاد، محقق اور دانش ور ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری میں انسانی نفسیات، معاشرتی تضادات، تہذیبی شناخت، اخلاقی زوال اور سماجی ناانصافی جیسے موضوعات بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ افسانے کو محض واقعات کی ترتیب یا قصہ گوئی تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اس کے ذریعے انسانی شعور، داخلی کشمکش اور اجتماعی رویوں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں علامت، استعارہ، فلسفیانہ تفکر اور گہرا سماجی مشاہدہ نمایاں ہے۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں "خاک کی مہک" خصوصی اہمیت

رکھتا ہے، جو 2016ء میں سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں انسانی زندگی کی پیچیدگیوں، سماجی رویوں، مذہبی منافقت، طبقاتی استحصال اور فرد کی شناخت کے مسائل کو مختلف زاویوں سے پیش کیا گیا ہے۔ مجموعے کا عنوان بھی علامتی معنویت رکھتا ہے۔ خاک کی مہک سے مراد محض مٹی کی خوشبو نہیں بلکہ انسان کی جڑوں، تہذیبی ورثے، ماضی اور اپنی اصل سے وابستگی کا احساس بھی ہے۔

ناصر عباس نیر کے افسانوں میں خود شناسی اور داخلی شعور کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ افسانہ "کہانی کا کوہِ ندا" میں استاد اور شاگردوں کے مکالمے کے ذریعے سچائی، جھوٹ اور انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ مصنف کے نزدیک انسان کو دوسروں کی آرا سے متاثر ہونے کے بجائے اپنی عقل، تجربے اور شعور سے کام لینا چاہیے۔ تاریکی اور روشنی کی علامتیں انسانی شخصیت کی کمزوریوں اور ان سے نجات کے امکانات کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "اکثر کے ساتھ صلہ یہ ہے کہ وہ اپنی تاریکی کو دوسروں کی دریافت کردہ روشنی سے دور کرنا چاہتے ہیں، حالاں کہ ان کی اپنی روشنی فنی کی تاریکی میں مضمر ہوتی ہے۔ اپنی تاریکی کا سامنا کرنے کا حوصلہ پیدا کرو، اپنی تاریکی کی گھنی سیاہی کے اندر اتروگے تو دیکھوگے کہ تاریکی لو دینے لگی ہے۔ تم یہ دیکھ کر حیران رہ جاؤگے کہ ہمیں اپنے زندگی کے اہم ترین فیصلوں تک پہنچانے والا راستہ تمہارے اپنے وجود کی ہولناک تاریکی سے پھوٹتا اور روشن ہوتا ہے۔ اپنی اپنی تاریکی کے کو ایک مقدس حقیقت سمجھ کر اس کا احترام کرنا سیکھو۔ دوسروں سے روشنی کی بھیک مت مانگو۔"[1]

یہ اقتباس خود شناسی اور خود احتسابی کی اہمیت واضح کرتا ہے۔ مصنف کے نزدیک انسان اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرکے ہی اصلاح کا راستہ تلاش کر سکتا ہے۔ دوسروں کی تقلید کے بجائے اپنے تجربات اور شعور سے رہنمائی حاصل کرنا شخصیت کی تعمیر کے لیے ضروری ہے۔ اسی طرح افسانہ "کفارہ" میں دیہی معاشرت کے مسائل، غیرت کے نام پر قتل، مذہبی منافقت اور سماجی بے حسی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ افسانہ نگار ایسے رویوں پر تنقید کرتے ہیں جن

میں اخلاقی اقتدار کے دعوے تو کیے جاتے ہیں، لیکن عملی زندگی میں انصاف اور انسانیت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس افسانے کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

"خدا داد یہ تو تم تسلیم کرو گے کہ تم جیسے بڑے بڑے مسلوں پر جھگڑے کرنے والے سامنے پڑی چیزوں سے بے خبر ہوتے ہیں وہ سامنے بیٹھے اس کتے سے بے خبر ہوتے ہیں۔ جو ایک لمحے میں ان کے جھگڑے نمٹا سکتا ہے خدا کے گھر جانے والے گلی میں پڑی اس لاش سے بے خبر ہوتے ہیں۔ جو ان کا جینا حرام کر سکتی ہے۔"[2]

یہ اقتباس ظاہر کرتا ہے کہ انسان اکثر مذہبی اور نظریاتی مباحث میں الجھ کر اپنے ارد گرد موجود حقیقی مسائل سے غافل ہو جاتا ہے۔ ناصر عباس نیر اس رویے کو معاشرتی بے حسی اور عملی منافقت کی علامت قرار دیتے ہیں۔ افسانے میں غیرت کے نام پر قتل کے ذریعے عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والے دوہرے معیار کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے۔ مصنف اس امر کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ معاشرے میں انصاف کا قیام اسی وقت ممکن ہے جب انسانی جان، عزت اور حقوق کو یکساں اہمیت دی جائے۔

افسانہ "ولدیت کا خانہ" میں شک، جہالت، کردار کشی اور فرسودہ سماجی تصورات کے تباہ کن اثرات کو نمایاں کیا گیا ہے۔ مرکزی کردار شیخ اسماعیل اپنی بیوی کے کردار کے بارے میں شکوک کا شکار ہو کر ایک نام نہاد پیر سے رجوع کرتا ہے۔ اس کا غیر منطقی رویہ نہ صرف اس کی ذاتی زندگی کو متاثر کرتا ہے بلکہ پورے معاشرتی ماحول میں بدگمانی اور انتشار پیدا کرتا ہے۔ اس افسانے میں عورت کے متعلق پائی جانے والی متعصبانہ سوچ کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"عورت ہی فساد کی جڑ ہے ہاں عورت مرد کی دنیا میں فساد پیدا کرتی ہے۔۔۔۔ سب عورتیں مرد کو مرد کو دھوکہ دے سکتی ہیں اور مرد بے چارہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔[3]

یہ اقتباس عورت کے متعلق پائی جانے والی پدرسری اور دقیانوسی سوچ کی نمائندگی کرتا ہے۔ افسانے کے تناظر میں یہ رویہ قابلِ تنقید ہے، کیونکہ معاشرتی مسائل کی تمام

ذمہ داری عورت پر ڈال کر مرد کے کردار اور اس کی ذمہ داریوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مصنف اس طرزِ فکر کے ذریعے معاشرے میں انصاف، مساوات اور اخلاقی شعور کی ضرورت اجاگر کرتے ہیں۔ اسی افسانے میں راز داری، توہم پرستی اور انسانی کمزوریوں کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔ اس ضمن میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "کون سا راز؟ وہ کیسا راز جسے تم اپنے سینے میں سنبھال نہیں سکے۔ اور دوسروں سے کہتے ہو کہ وہ سنبھالیں۔ تم لوگ اپنے راز ہی تو بھرے بازار میں لانے کے لیے مر رہے ہو۔"[4]

اس اقتباس میں انسانی کمزوری، راز داری اور معاشرتی منافقت کو نمایاں کیا گیا ہے۔ انسان جب اپنے معاملات میں احتیاط اور عقل مندی سے کام نہیں لیتا تو اسے دوسروں کے ہاتھوں رسوائی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ افسانہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ توہم پرستی اور ذاتی مفادات کس طرح لوگوں کے درمیان اعتماد کو ختم کر دیتے ہیں۔ مصنف کے نزدیک معاشرتی پسماندگی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگ دلیل اور تحقیق کے بجائے غیر معمولی حیثیت رکھنے والے افراد کی بات کو حتمی سچ سمجھ لیتے ہیں۔ اس حوالے سے افسانے کا ایک اور اقتباس قابلِ توجہ ہے:

> "اس آدمی کی بات کو تم جلدی مان لیتے ہو جو ذرا سا برابر ہو مطلب یہ ہے تمہاری سمجھ سے ذرا اوپر ہو۔ تم اپنے برابر والے اور چھوٹے کی بات نہ سنتے ہو نہ مانتے ہو۔ تم سب کو ایک سائیں اور ایک شاہ صاحب ہر وقت چاہیے۔[5]

یہ اقتباس شخصیت پرستی، ذہنی غلامی اور غیر تنقیدی رویے پر طنز کرتا ہے۔ مصنف کے مطابق معاشرتی شعور کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ افراد ہر بات کو تحقیق، دلیل اور عقل کی کسوٹی پر پرکھیں۔ جب لوگ اپنی فکری صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے بجائے دوسروں کے اندھے مقلد بن جاتے ہیں تو معاشرے میں توہم پرستی اور استحصال کو فروغ ملتا ہے۔

افسانہ "خاک کی مہک" میں مٹی کو شناخت، یادداشت اور تہذیبی وابستگی کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ انسان اپنی زندگی میں ترقی، آزادی اور انفرادی شناخت حاصل

کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن اس عمل میں اپنی جڑوں سے دوری بھی محسوس کر سکتا ہے۔ افسانہ اس داخلی کشمکش کو نمایاں کرتا ہے جو فرد کو اپنی اصل، خاندانی روایات اور ذاتی خواہشات کے درمیان درپیش ہوتی ہے۔ مصنف انسانی فطرت اور معاشرتی ماحول کے تعلق پر بھی غور کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"میں یہ نہیں بتا سکتا کہ مکمل برائی کا تصور کا کب اور کس نے پیدا کیا۔۔۔ اپنے گاؤں کے لوگوں کی حد تک مجھے یقین ہو چلا ہے کہ مکمل برائی کا تصور آدمی کے اندر اس کی پیدائش کے ساتھ نہیں آتا۔"[6]

یہ اقتباس انسانی فطرت اور معاشرتی ماحول کے تعلق کو نمایاں کرتا ہے۔ افسانے کے تناظر میں انسان کے رویوں کی تشکیل میں اس کے تجربات، معاشرتی حالات اور دوسروں کے ساتھ تعلقات اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس طرح مصنف برائی کو محض انفرادی کردار کا مسئلہ سمجھنے کے بجائے اس کے سماجی اسباب کی طرف بھی توجہ دلاتے ہیں۔ ''خاک کی مہک ''کا بنیادی تصور بھی انسان کی اپنی تہذیبی جڑوں، ماضی اور شناخت سے وابستگی کے گرد گھومتا ہے۔ افسانہ یہ واضح کرتا ہے کہ انفرادی ترقی اور خود مختاری کے باوجود انسان اپنی اصل سے مکمل طور پر لاتعلق نہیں ہو سکتا۔

ناصر عباس نیر کے افسانوی مجموعے میں "ہاں یہ بھی روشنی ہے" بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اس افسانے میں روشنی اور تاریکی کو نفسیاتی اور وجودی علامتوں کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ مرکزی کردار معرفت اور خود شناسی کی تلاش میں گھر بار چھوڑ کر جنگلوں کا رخ کرتا ہے، لیکن طویل عرصے بعد اسے احساس ہوتا ہے کہ زندگی کی معنویت صرف تنہائی اور ترکِ دنیا میں نہیں بلکہ انسانی رشتوں اور ذمہ داریوں کی ادائیگی میں بھی پوشیدہ ہے۔ افسانہ اس تصور پر تنقید کرتا ہے کہ ذاتی نجات کے لیے دنیا اور رشتوں سے مکمل کنارہ کشی ضروری ہے۔ مصنف کے نزدیک روحانی اور فکری ترقی اسی وقت بامعنی ہوتی ہے جب انسان اپنے ساتھ دوسروں کے حقوق اور جذبات کو بھی اہمیت دے۔

اسی طرح "جھوٹ کا فیسٹیول" جدید معاشرے کی منافقت، طاقت کے غلط استعمال اور اخلاقی زوال کی علامتی عکاسی کرتا ہے۔ اس افسانے میں جھوٹ کو ایک ایسے سماجی مظہر کے

طور پر پیش کیا گیا ہے جسے لوگ اپنی کامیابی، شہرت اور مفادات کے حصول کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ زمیندار اور طاقت ور طبقات کے کرداروں کے ذریعے معاشی استحصال اور عورت کی بے بسی کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ شادی جیسے مقدس رشتے کو ذاتی خواہشات اور مالی طاقت کے تابع کر دینا معاشرتی اقدار کے زوال کی علامت بن جاتا ہے۔ اس طرح مصنف اس دوہرے معیار پر سوال اٹھاتے ہیں جس میں بااثر افراد کی بدکرداری کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، جب کہ کمزور طبقات اس کے نتائج بھگتتے ہیں۔

ناصر عباس نیر کے دیگر افسانوں میں "مرنے کے بعد مسلمان ہوا جا سکتا ہے؟" مذہبی تعصب، طبقاتی امتیاز اور عورت کے معاشی استحصال کو موضوع بناتا ہے۔ اس میں ایک مجبور عورت کی زندگی کے ذریعے دکھایا گیا ہے کہ معاشرتی تعصبات کس طرح انسانی وقار کو مجروح کرتے ہیں۔ "کہاں ہوں" میں شناخت کے بحران، تاریخ، زبان اور اجتماعی یادداشت کے مسائل کو علامتی اور فلسفیانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ "بشن سنگھ مرا نہیں تھا" میں سعادت حسن منٹو کے افسانے "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کے ساتھ بین المتونی تعلق قائم ہوتا ہے۔ اس افسانے کے ذریعے تاریخ کے مظلوم کرداروں، طاقت کے جبر اور اجتماعی بے حسی پر سوال اٹھایا گیا ہے۔ اسی طرح "بو آئی کہاں سے" میں بدبو کو اخلاقی تعفن، منافقت اور معاشرتی زوال کی علامت بنایا گیا ہے، جب کہ "ستر سال اور غار" جدید انسان کی وجودی بے معنویت اور اپنی حقیقی شناخت سے دوری کی عکاسی کرتا ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے افسانوی مجموعے "راکھ سے لکھی گئی کتاب" کے موضوعاتی اور فنی مطالعے کو مختصر کرتے ہوئے دس اہم اقتباسات کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس تحریر میں افسانوں کے بنیادی موضوعات، علامتی اسلوب، سماجی شعور اور فکری معنویت کو نمایاں رکھا گیا ہے۔ اقتباسات فراہم کردہ مواد سے لیے گئے ہیں؛ ان کے الفاظ میں ممکنہ کتابتی غلطیاں اصل کتاب سے ملا کر درست کی جا سکتی ہیں۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر جدید اردو افسانے کے اہم افسانہ نگار، نقاد اور محقق ہیں۔ ان کے افسانوں میں انسانی نفسیات، تہذیبی شناخت، سیاسی جبر، سماجی ناانصافی، تاریخی شعور اور فرد کی

داخلی کشمکش کو موضوع بنایا گیا ہے۔ وہ عام واقعات کے ذریعے زندگی کے پیچیدہ مسائل کو علامتی اور فلسفیانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے "راکھ سے لکھی گئی کتاب" میں جدید انسان کی تنہائی، فکری بے چینی اور معاشرتی تضادات نمایاں ہیں۔ ان کے نزدیک انسان کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنے اندرونی شور اور ذاتی مفادات میں اس قدر الجھ جاتا ہے کہ اپنے ماحول اور دوسرے انسانوں کی آواز سننے سے قاصر رہتا ہے۔ افسانہ ''درخت باتیں ہی نہیں کرتے ''میں اسی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"دنیا میں سب سے اونچی آواز وہ ہے جو آدمی کے اندر ہوتی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی اور کی آواز اول تو سنائی نہیں دیتی، سنائی سنائی دے تو اس کا مطلب وہی ہوتا ہے جو آدمی کے اندر کی آواز کا ہوتا ہے۔"[7]

یہ اقتباس جدید انسان کی خود مرکزیت اور فطرت سے دوری کی عکاسی کرتا ہے۔ افسانے میں درخت زندگی، تسلسل اور فطری ربط کی علامت ہیں، جب کہ انسان کی داخلی آواز اس کے لیے دوسروں کو سمجھنے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ مصنف اس امر کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ حقیقی شعور کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے اندر کے شور سے نکل کر خارجی دنیا اور دوسرے انسانوں کے تجربات کو بھی اہمیت دے۔

افسانہ "عورت کو زیادہ محبت کس سے ہے؟" میں خاندانی رشتوں، جذباتی وابستگی اور انسانی فطرت کے پیچیدہ پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔ چند ایکڑ زمین کے تنازع پر بیٹے کے ہاتھوں باپ کا قتل محض ایک فرد کی موت نہیں بلکہ خاندانی رشتوں اور انسانی اقدار کی شکست ہے۔ افسانے میں ماں کو ایک ایسی کرب ناک صورتِ حال کا سامنا ہے جہاں اسے بیٹے کی محبت اور شوہر کے قتل کے صدمے کے درمیان فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

"ہر قتل یہ یقین دلاتا ہے کہ زندگی کے جھگڑے مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتے۔ صرف زندگی ختم نہیں ہوتی رشتے ناطے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی حقیقت صرف فنا نہیں، فراموشی بھی ہے۔" [8]

یہ اقتباس واضح کرتا ہے کہ لالچ اور مادی مفادات کس طرح مقدس رشتوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ ناصر عباس نیر انسانی نفسیات کے تاریک پہلوؤں کو سامنے لاتے ہوئے بتاتے ہیں کہ بعض تنازعات زندگی کے خاتمے کے بعد بھی جذباتی اور اخلاقی سطح پر زندہ رہتے ہیں۔

افسانہ "پرانا اور نیا نظام انصاف" میں قدیم روایتی نظام اور جدید قانونی ڈھانچے کے تضادات کو علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مصنف دکھاتے ہیں کہ جب انصاف کا نظام طاقت ور طبقے کے مفادات کے تابع ہو جائے تو عام انسان ظلم، خوف اور بے بسی کا شکار بن جاتا ہے۔ اس افسانے میں جرم، نیت اور سزا کے تعلق پر بھی سوال اٹھایا گیا ہے:

> "کسی بھی شخص سے کسی بھی طرح کے جرم کا ارتکاب ممکن ہے۔ آج کل، یا پرسوں یا کسی بھی وقت۔ اگر وہ جرم نہیں کرتا تو اس کا سبب یہ نہیں کہ وہ جرم کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ بلکہ اس لیے کہ اسے جرم کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔" [9]

اس اقتباس میں انسانی فطرت اور اخلاقی تربیت کے مسئلے کو نمایاں کیا گیا ہے۔ مصنف اس بات پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں کہ کسی شخص کے ممکنہ عمل کی بنیاد پر اسے مجرم قرار دینا کہاں تک درست ہے۔ افسانہ انصاف کے نظام میں طاقت، اختیار اور انسانی آزادی کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔

"ایک پرانی تصویر کی نئی کہانی" میں تاریخ، تہذیبی شناخت اور روایت و جدیدیت کے تصادم کو موضوع بنایا گیا ہے۔ تصویر ماضی کی یاد، اجتماعی حافظے اور ثقافتی ورثے کی علامت بن جاتی ہے۔ مصنف انسانی تخیل کی حدود اور ان حدود سے تجاوز کے نتائج پر بھی غور کرتے ہیں۔ افسانے میں درج ہے:

> "انسانی تخیل الوہی تصویر کی نقل کر ہی نہیں سکتا۔ الوہی تخیل کس طرح کام کرتا ہے اور اس کی حدیں کہاں کہاں ہیں یا سرے سے حدوں سے ماورا ہے، اسے انسانی عقل سمجھ سکتی ہے نہ انسانی تخیل۔"[10]

یہ اقتباس انسانی عقل اور تخیل کی محدودیت کو واضح کرتا ہے۔ افسانہ اس سوال کو سامنے لاتا ہے کہ انسان جب اپنی صلاحیتوں اور حدود کو نظر انداز کر کے ہر شے پر مکمل اختیار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے نفسیاتی اور اخلاقی نتائج کیا ہو سکتے ہیں۔ اس طرح مصنف فکری خود احتسابی اور انسانی حدود کے شعور کی اہمیت اجاگر کرتے ہیں۔

افسانہ "عقیدہ آدمی کا ہوتا ہے، لاش کا نہیں" میں جبر، علم دشمنی اور اختلافِ رائے کو دبانے کے رویے پر تنقید کی گئی ہے۔ ناصر عباس نیر کے نزدیک طاقت ور طبقات باشعور انسانوں سے اس لیے خوف زدہ رہتے ہیں کہ وہ رائج نظام پر سوال اٹھانے اور عوام میں فکری بیداری پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "ذہین لوگوں سے زیادہ کوئی خطرناک نہیں ہوتا جو خود سوچتا ہے وہ شر پھیلاتا ہے۔ خلیفہ اور اس کے دربار میں موجود عالموں کے ہوتے ہوئے جو سوچتا ہے وہ شر پھیلاتا ہے اس کی شر سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے اسے سوچنے ہی نہ دیا جائے۔"[11]

یہ اقتباس آزادانہ سوچ کو خطرہ سمجھنے والی ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔ مصنف واضح کرتے ہیں کہ جب اقتدار اختلاف اور سوال کو برداشت نہیں کرتا تو علم، تحقیق اور تخلیقی اظہار محدود ہو جاتے ہیں۔ اس افسانے میں دانش ور کی فکری زندگی کو جسمانی موت سے زیادہ دیرپا قرار دیا گیا ہے، کیونکہ اس کے خیالات اور علمی اثرات اس کی وفات کے بعد بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔

"راکھ سے لکھی گئی کتاب" میں تاریخ کے مسخ ہونے، مٹتی ہوئی شناخت اور دبائی گئی آوازوں کی بازیافت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ راکھ تباہی اور فنا کی علامت ہے، جب کہ اس سے کتاب لکھنا ماضی کے منتشر آثار سے نئے معنی اخذ کرنے کے مترادف ہے۔ مصنف تخلیق کو ایک سماجی اور تہذیبی عمل سمجھتے ہیں: دنیا کی ہر کتاب دوسری کتابوں سے کوئی نہ کوئی تعلق رکھتی ہے۔ دنیا کی ہر کتاب کا تعلق دنیا میں موجود ہر شخص سے ضرور ہوتا ہے۔ جو شخص دنیا کو چل پھر کر دیکھتا ہے اور اپنی نظر سے دیکھتا ہے وہی راکھ سے نئی کتاب ترتیب دے سکتا ہے۔ تخلیق محض انفرادی عمل نہیں بلکہ تاریخی تجربات، ثقافتی ورثے اور ذاتی مشاہدات کا نتیجہ ہوتی ہے۔

مصنف تاریخ کے یک طرفہ بیانیوں کے بجائے ان آوازوں کو اہمیت دیتے ہیں جنھیں طاقت ور طبقات نے نظر انداز کر دیا ہو۔ اس اعتبار سے افسانہ شناخت کی بازیافت اور متبادل تاریخ کی تشکیل کا استعارہ بن جاتا ہے۔

افسانہ "نکاح ٹوٹ سکتا ہے، قسم نہیں" میں ازدواجی رشتوں، عہد، جذباتی وابستگی اور سماجی عدم استحکام کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مصنف دکھاتے ہیں کہ بعض اوقات ایک مختصر تحریر یا فیصلہ انسان کی پوری زندگی کو بدل دیتا ہے۔ افسانے میں اس کیفیت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

> "ایک خط کاغذ کا پرزہ زندگی جہنم بنا سکتا ہے یہ پہلا خیال تھا جو مجھے
> سوجھا۔ اس پہ لکھی تین سطریں تمہیں اس تنور میں پھینک دیتی ہیں،
> جس کا بالن آدمیوں کی ہڈیاں ہیں۔"[12]

یہ اقتباس انسانی زندگی میں الفاظ اور فیصلوں کی غیر معمولی اہمیت واضح کرتا ہے۔ افسانہ اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ جذباتی اور سماجی رشتوں سے متعلق فیصلوں کے اثرات صرف دو افراد تک محدود نہیں رہتے بلکہ خاندان اور آئندہ نسلوں کو بھی متاثر کر سکتے ہیں۔

"گم نام خط" میں خوف، نگرانی اور طاقت کے نفسیاتی استعمال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ افسانہ اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ جبر پر قائم نظام لوگوں کو محض جسمانی طاقت سے نہیں بلکہ خوف اور غیر یقینی صورتِ حال کے ذریعے بھی قابو میں رکھتا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

> "اس صدی کا سب سے بڑا انقلاب یہی ہے کہ چھپنے کی جگہیں کم سے کم
> ہو گئی ہیں اور ان کے لیے تو بہت کم ہیں جو کچھ بھی لکھتے ہیں۔ ہر تحریر سانپ کی
> اس یکسر کی طرح ہے جو کسی نہ کسی نام تک پہنچ کر دم لیتی ہے۔"[13]

اس اقتباس میں تحریر کی ذمہ داری اور انسانی اعمال کے نتائج کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مصنف کے نزدیک تحریر محض الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک ایسا عمل ہے جو افراد، اداروں اور معاشرتی رویوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ افسانہ اظہارِ رائے، نگرانی اور سماجی جواب دہی کے مسائل کو بھی سامنے لاتا ہے۔

افسانہ "موت کا کاروبار" میں انسانی بے حسی، استحصال اور مادی مفادات کے غلبے کو طنزیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ موت، جو انسانی زندگی کا نہایت سنجیدہ اور دردناک پہلو ہے، جب کاروبار بن جائے تو یہ معاشرے کی اخلاقی پستی کی علامت بن جاتی ہے۔ افسانے میں لکھا ہے:

> "وہ دن دور نہیں جب لاشیں زیادہ اور انہیں دفنانے والے کم پڑ جائیں گے ایسا وقت آیا تو لوگ لاشوں کو گدھوں کے حوالے کر کے خود نیند کی گولیاں کھایا کریں گے۔
> گدھ کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ سارے گدھ اڑنے والے تھوڑی ہوتے ہیں۔"[14]

یہ اقتباس استحصالی رویوں پر گہرا طنز کرتا ہے۔ یہاں گدھ صرف مردہ جسموں کو کھانے والے پرندوں کی علامت نہیں بلکہ ان مفاد پرست عناصر کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں جو دوسروں کی مجبوریوں اور المیوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مصنف معاشرتی بے حسی کو انسانی اقدار کے زوال سے جوڑتے ہیں اور قاری کو ہمدردی، ذمہ داری اور اخلاقی شعور کی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں۔

افسانہ "یہ خدا کہاں نہیں رہتے؟" میں طاقت، خوف اور تشدد کے نفسیاتی اثرات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہاں "خدا" کا تصور علامتی معنویت رکھتا ہے اور ایسے بااختیار افراد یا نظاموں کی نمائندگی کرتا ہے جو دوسروں پر اپنی مرضی مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ مصنف لکھتے ہیں:

> "سب خدا اپنی جگہ صورت تیور کے ساتھ ساتھ زبان بھی اپنی ایجاد کرتے ہیں۔ تاکہ انہیں کوئی ٹھیک ٹھیک پہچان نہ سکے تاکہ کوئی انہیں پوری طرح سمجھ نہ سکے تاکہ وہ سب کچھ کرنے کا اختیار حاصل کر سکیں۔ جو وہ چاہیں، تاکہ وہ سب چاہیں جسے اب تک چاہا نہیں گیا۔"[15]

یہ اقتباس طاقت کے ان رویوں کو ظاہر کرتا ہے جو اپنی اصل اور مقاصد کو پوشیدہ رکھ کر دوسروں کی زندگیوں پر اختیار قائم کرنا چاہتے ہیں۔ افسانہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ ظلم صرف ظالم کے عمل سے مضبوط نہیں ہوتا بلکہ لوگوں کی خاموشی، خود غرضی اور بے حسی بھی اسے تقویت دیتی ہے۔

مجموعی طور پر ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے افسانوی مجموعے "راکھ سے لکھی گئی کتاب" میں جدید انسان کے وجودی بحران، تاریخی شعور، سماجی ناانصافی، سیاسی جبر، انسانی رشتوں اور تہذیبی

شناخت کے مسائل کو فکری گہرائی سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کا اسلوب علامتی، فلسفیانہ اور نفسیاتی ہے، جس میں عام واقعات و سیع سماجی اور انسانی معنویت اختیار کرلیتے ہیں۔ ان کے افسانے قاری کو مروجہ تصورات پر سوال اٹھانے، تاریخ کے دبائے گئے پہلوؤں کو سمجھنے اور اپنی اخلاقی ذمہ داریوں کا جائزہ لینے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہی خصوصیات ان کے افسانوں کو محض قصہ گوئی سے بلند کر کے جدید اردو افسانے کی فکری اور تنقیدی روایت میں اہم مقام عطا کرتی ہیں۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے افسانے مابعد جدید فکری شعور، علامت نگاری، شناخت کے بحران، سماجی ناانصافی اور انسانی وجود کے پیچیدہ مسائل کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں زبان، طاقت، وراثت اور انسانی رویوں کو علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ پانچ منتخب افسانوں کے مختصر تجزیے اور اقتباسات درج ذیل ہیں۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر کا افسانہ "لوگوفوبیا" زبان اور طاقت کے باہمی تعلق کو نمایاں کرتا ہے۔ اس میں زبان محض اظہار کا وسیلہ نہیں بلکہ معنی متعین کرنے، شناخت تشکیل دینے اور فرد کو فکری طور پر قابو میں رکھنے کا ذریعہ ہے۔ لفظوں کا خوف دراصل انسان کی فکری آزادی پر عائد پابندیوں کی علامت ہے۔

افسانہ "ابا کا صندوق" وراثت، شناخت اور روحانی تسلسل کی کہانی ہے۔ صندوق میں موجود اشیا علی کو اپنے باپ کی یاد اور اپنی ذات کے ادراک سے جوڑتی ہیں۔ مصنف واضح کرتا ہے کہ وراثت صرف دولت اور جائیداد نہیں بلکہ فکر، یادداشت اور تجربات کا تسلسل بھی ہے۔

"وہ لاٹھی اور آئینے کی طرف متوجہ ہوا۔ لاٹھی صندل کی لکڑی کی تھی۔ اس کی
خوشبو نے اس پر خوشگوار اثر ڈالا۔ اس نے دستے سے لاٹھی پکڑی۔"[16]

افسانہ "ہو سکتا ہے یہ خط آپ کے نام لکھا گیا ہو" میں خط ماضی، انسانی تنہائی اور نامکمل رشتوں کی علامت ہے۔ ایک پرانی کتاب سے ملنے والا خط مرکزی کردار کو ایک ایسی جستجو میں مبتلا کرتا ہے جس میں وہ کسی اجنبی پیغام کے ساتھ اپنا تعلق محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس طرح تحریر مختلف زمانوں اور انسانی تجربات کے درمیان رابطہ قائم کرتی ہے۔

"اس خط کو میں اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ مجھے اس اسے اسی شخص تک
پہنچانا ہے جس کے لیے یہ لکھا گیا تھا۔ آخر ہر خط کوئی دوسرا ہی
مکتوب الیہ تک پہنچاتا ہے۔ وہ دوسرا میں ہی سہی۔"[17]

افسانہ "شکر اس کا جس نے ہمیں آدمی یا سور نہیں بنایا" انسانی تہذیب کے اخلاقی زوال کو طنزیہ اور علامتی انداز میں پیش کرتا ہے۔ جانوروں کے نقطۂ نظر سے انسان کی خواہشات، ذہنی لذتوں اور سماجی رویوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنف اس تضاد کو نمایاں کرتا ہے کہ انسان عقل و شعور کا دعوے دار ہونے کے باوجود بعض اوقات حیوانی خواہشات کا اسیر بن جاتا ہے۔

"لگتا ہے، تم میں بھی آدمی کا دماغ سما گیا ہے۔ بوڑھی چیونٹی بولی۔ تم بھنے ہوئے
گوشت سے زیادہ، اس کے ذکر میں لذت محسوس کر رہی ہو۔"[18]

افسانہ "گھسا ہوا جوتا" شناخت، انفرادیت اور خود شناسی کے موضوعات پر مبنی ہے۔ اس میں "اسم" کی تلاش انسان کی اصل پہچان دریافت کرنے کی علامت ہے، جب کہ گھسا ہوا جوتا زندگی کے سفر، تجربات اور وقت کے اثرات کی نمائندگی کرتا ہے۔ مصنف دکھاتا ہے کہ انسان کی شناخت صرف نام یا ظاہری شکل سے متعین نہیں ہوتی بلکہ اس کے تجربات اور باطنی شعور بھی اس میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

"یہ بات میرے پلے نہیں پڑی کہ کسی کے مخصوص اسم کا فیصلہ کوئی
دوسرا کیسے کر سکتا ہے؟ میری ایک مشکل یہ بھی تھی کہ میں اپنے اسم
کو اپنے ماتھے، اپنی آنکھ کے رنگ اور اپنے انگوٹھے کی مانند سمجھنے سے قاصر
تھا۔"[19]

ناصر عباس نیر کا افسانوی مجموعہ "ایک زمانہ ختم ہوا ہے 2020ء" میں سنگِ میل پبلی کیشنز کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ یہ مجموعہ بارہ افسانوں پر مشتمل ہے، جن میں انسانی نفسیات، سماجی ناانصافی، سیاسی جبر، تہذیبی زوال، یادداشت، شناخت اور اخلاقی بحران جیسے موضوعات کو علامتی اور فکری انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ نیر روزمرہ زندگی کے معمولی واقعات کو وسیع سماجی اور انسانی مسائل سے مربوط کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں فرد کی داخلی کشمکش کے ساتھ ساتھ طاقت کے نظام، معاشرتی منافقت اور انسانی اقدار کی شکست و ریخت بھی نمایاں ہے۔

افسانہ "تمہارا قانون" میں مصنف نے نظامِ عدل کی بے حسی اور طاقت کے غیر انسانی استعمال کو موضوع بنایا ہے۔ پانچ بے گناہ قیدیوں کے ذریعے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جب قانون انصاف کے بجائے طاقت ور طبقے کے مفادات کا محافظ بن جائے تو مظلوم کی آواز دب جاتی ہے۔ قیدیوں پر ہونے والے تجربات انسانی حرمت کی پامالی اور ریاستی جبر کی علامت ہیں۔ مصنف کے نزدیک زبان اور شناخت بھی بعض اوقات اقتدار کے لیے ایک آلے کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ اس ضمن میں افسانے کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> "قیدی نے سوائے حیرت کے کچھ محسوس نہیں کیا۔ اس بات پر حیرت کہ وہ اتنی روانی سے ان کی زبان بول رہا ہے، لیکن وہ جلد ہی سنبھل گیا۔ اسے کسی نے اندر سے سرگوشی کی :زبان کی اپنائیت بھی ایک گڑھا ہے۔ بچو۔ اس سے"[20]

یہ اقتباس زبان کی اپنائیت کے پسِ پردہ چھپے خطرے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ افسانہ واضح کرتا ہے کہ جبر کے نظام میں بظاہر مانوس چیزیں بھی انسان کو فریب دے سکتی ہیں۔

افسانہ "ہر آدمی ہر کام کر سکتا ہے" میں انسانی آزادی، ارادے اور اخلاقی شعور کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ مرکزی کردار رفتہ رفتہ ایسے نظام کا حصہ بن جاتا ہے جو اس کی انفرادی سوچ اور ضمیر کو کمزور کر کے اسے محض حکم بجا لانے والا آلہ بنا دیتا ہے۔ مصنف دکھاتا ہے کہ جب انسان سوال کرنے اور اپنے اعمال کی اخلاقی ذمہ داری قبول کرنے سے دست بردار ہو جائے تو وہ ظلم میں شریک ہو سکتا ہے۔ فوجیوں کی ذہنی تبدیلی اور جنگ میں ان کے ہاتھوں ہونے والی ہلاکتیں اس بات کی علامت ہیں کہ طاقت ور ادارے تربیت کے نام پر انسانی فطرت کو مسخ کر سکتے ہیں۔

"خوابِ سگاں" میں کتوں کی نسلوں کے حوالے سے تہذیبی شناخت، نو آبادیاتی ذہنیت اور ماضی سے لاتعلقی کے موضوعات اجاگر ہوتے ہیں۔ کتے یہاں محض حیوان نہیں بلکہ مقامی روایت، وفاداری اور فطری زندگی کی علامت ہیں۔ سراج ملک کا کردار تحفظ کے نام پر اختیار قائم کرنے والی ذہنیت کی

نمائندگی کرتا ہے، جب کہ پرانی نسلوں سے وابستگی تہذیبی حافظے کی اہمیت کو نمایاں کرتی ہے۔ اس افسانے کا اقتباس دیکھیے:

> "یہ زمین ہم سب کی ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ "ہم" سے مراد ہم خود کو لیتے ہیں۔ ہمارا تکبر اس دنیا کو برباد کر کے چھوڑے گا) میں نے زہریلی ہنسی مشکل سے ضبط کی (سراج صاحب نے کہا۔ حالاں کہ وہ سب مخلوق جو زمین پر رہتی ہے، وہ ہم سب میں شامل ہے۔"[21]

یہ اقتباس انسانی خود غرضی اور تکبر پر تنقید کرتا ہے۔ مصنف واضح کرتا ہے کہ انسان جب پوری زمین اور اس کے وسائل کو صرف اپنی ملکیت سمجھنے لگتا ہے تو وہ دوسری مخلوقات کے وجود اور حقوق کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

افسانہ "غارت گر" میں محبت، احساسِ جرم، ذہنی انتشار اور انسانی رشتوں کی پیچیدگی کو خطوط کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ خطوط کرداروں کے باطن، ان کی یادوں اور نامکمل جذبات کو آشکار کرتے ہیں۔ عورت کا کردار اس معاشرتی رویے کی نشان دہی کرتا ہے جہاں عورت کے جذبات اور اعترافات کو اکثر شک اور کردار کشی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ دوسری طرف عبداللہ کی شخصیت خاندانی کشیدگی اور جذباتی محرومیوں کے اثرات کو ظاہر کرتی ہے۔ اس طرح محبت محض رومانوی جذبہ نہیں رہتی بلکہ ایک ایسا نفسیاتی تجربہ بن جاتی ہے جو انسان کی زندگی، فیصلوں اور وجود کو متاثر کرتا ہے۔

"آخری تحریر" میں زندگی اور موت، تخلیق، یادداشت اور احساسِ ندامت کے موضوعات نمایاں ہیں۔ بیمار مرکزی کردار کو بار بار ایک ہیولا آخری تحریر لکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ یہ ہیولا موت، ضمیر یا کردار کے تخلیقی شعور کی علامت بن جاتا ہے۔ کردار اپنی زندگی کے گزرے ہوئے لمحوں اور رشتوں پر غور کرتے ہوئے اپنی ذات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ افسانہ اس خیال کو تقویت دیتا ہے کہ فنا کے احساس کے باوجود انسان اپنے وجود کو معنی دینے اور اپنی کہانی مکمل کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔

افسانہ "قصہ کتابوں کے قبرستان کا" علم، کتاب اور تہذیبی حافظے کے زوال کو علامتی انداز میں پیش کرتا ہے۔ کتابوں کے قبرستان کا تصور ان تحریروں اور خیالات کی موت کا استعارہ

ہے جنہیں معاشرہ پڑھنا اور سمجھنا چھوڑ دیتا ہے۔ عجب الدولہ کا کردار اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ کتاب کی اہمیت محض اس کی مادی موجودگی میں نہیں بلکہ اس کے فکری اثر اور قاری سے تعلق میں پوشیدہ ہے۔ اس افسانے میں کتابوں کی موت دراصل معاشرے کی فکری بے اعتنائی اور علمی زوال کی نشان دہی کرتی ہے۔

"اسے کسی عورت نے جنم نہیں دیا" میں ایک پراسرار کردار کے ذریعے جدید انسان کی بے ماخذی، اجنبیت اور شناخت کے بحران کو پیش کیا گیا ہے۔ بازار کے لوگ اس کردار کے بارے میں مختلف مفروضے قائم کرتے ہیں، جو انسانی ذہن کی اس عادت کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ نامعلوم حقیقت کو اپنی سوچ کے مطابق معنی پہنانے لگتا ہے۔ بالآخر اس کردار کی صورت میں معاشرہ اپنے ہی چہرے سے روبرو ہوتا ہے۔ یوں افسانہ فرد کے جنون یا پراسراریت سے آگے بڑھ کر اجتماعی بے حسی اور انسانی شناخت کے مسئلے کو موضوع بناتا ہے۔

افسانہ "مرگِ عام نعمت ہے" میں سیاسی طاقت، خوف اور اجتماعی تباہی کو علامتی پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ شاہی ماحول اور کرداروں کی بے یقینی اس حقیقت کو نمایاں کرتی ہے کہ اقتدار بظاہر قوت کا نشان ہے، مگر اس کے اندر خوف اور عدم تحفظ بھی موجود رہتے ہیں۔ اجتماعی موت کو نعمت قرار دینے کا تصور ایک تلخ طنز ہے، جو ایسے معاشرتی نظام کی عکاسی کرتا ہے جہاں زندگی جبر اور ذلت سے بھر جائے تو موت بھی نجات محسوس ہونے لگتی ہے۔

"اتنے آوارہ کتے کہاں سے آئے؟" میں جانوروں کے قتل کے واقعے کے ذریعے معاشرتی بے حسی اور کمزوروں کے خلاف تشدد کو موضوع بنایا گیا ہے۔ آوارہ کتے ان بے آواز اور بے سہارا وجودوں کی علامت ہیں جنہیں معاشرہ مسئلہ سمجھ کر ختم کرنا چاہتا ہے۔ زخمی کتے کو پانی پلانے والا بچہ اس ماحول میں ہمدردی اور انسانیت کی باقی ماندہ رمق کی نمائندگی کرتا ہے۔ افسانے کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> "یہاں آوارہ کتے بڑھ گئے ہیں۔ پانچ مار دیے ہیں۔ بندوق بردار نے اسے گیٹ کے پاس پہنچتے دیکھ کر کہا۔ ابھی گاڑی آئے گی اور اسے اٹھا لے جائے گی۔ یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔"[22]

اس اقتباس میں بندوق بردار کا بے تاثر لہجہ تشدد کے معمول بن جانے کو ظاہر کرتا ہے۔ مصنف روزمرہ کے ایک واقعے کے ذریعے یہ سوال اٹھاتا ہے کہ معاشرہ کمزور مخلوق کے دکھ کے مقابلے میں کس حد تک بے حس ہو چکا ہے۔

افسانہ "ملبے کا بزنس" قتل، طاقت اور سماجی منافقت کے موضوعات کو سامنے لاتا ہے۔ مصنف قتل کو محض ایک انفرادی جرم نہیں بلکہ ایسا مسئلہ قرار دیتا ہے جو انسانی معاشرے، فکر اور اخلاقیات میں مسلسل موجود رہتا ہے۔ ملبہ یہاں عمارتوں کی تباہی تک محدود نہیں بلکہ انسانی ضمیر اور اقدار کے انہدام کا استعارہ بھی ہے۔ افسانے کا اقتباس اس کے فکری پہلو کو واضح کرتا ہے:

> "قتل ایک علمی مسئلہ ہے یا نہیں، یہ مجھے معلوم نہیں۔ اتنا معلوم ضرور ہے کہ یہ ایک عمل بھی ہے اور مسئلہ بھی۔ عمل کہیں کسی وقت ہوتا ہے مگر مسئلے کے طور پر ہر وقت ہر جگہ یہ موجود ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ ہماری دنیا سے باہر کی دنیاؤں میں بھی موجود ہے۔"[23]

یہ اقتباس قتل کے انفرادی واقعے کو ایک وسیع اخلاقی اور فکری مسئلے میں تبدیل کر دیتا ہے۔ افسانہ اس معاشرتی رویے پر بھی تنقید کرتا ہے جو ظلم اور تشدد کو دلچسپی کا موضوع تو بناتا ہے، مگر سچائی اور انصاف کے تقاضوں سے گریز کرتا ہے۔

افسانہ "یاد اور بھول کا کھیل" انسانی حافظے، اخلاقی فیصلوں اور ضمیر کی پیچیدگیوں کا مطالعہ ہے۔ کسی ایک شخص کو قتل کر کے اپنی جان بچانے کے فرضی انتخاب کے ذریعے مصنف یہ دکھاتا ہے کہ انسان کے فیصلوں پر اس کی یادیں، ذاتی تجربات اور تعصبات اثر انداز ہوتے ہیں۔ یادداشت کبھی کسی شخص کے خلاف فیصلہ کرنے کا جواز بنتی ہے اور کبھی ہمدردی کو جنم دیتی ہے۔ بھولنا بعض اوقات ذہنی بقا کا ذریعہ بن جاتا ہے، لیکن یہی عمل ظلم کو نظر انداز کرنے کا سبب بھی بن سکتا ہے۔

مجموعی طور پر "ایک زمانہ ختم ہوا ہے" میں ناصر عباس نیر نے علامتی اور فکری اسلوب کے ذریعے انسانی وجود، سماجی جبر، سیاسی طاقت، تہذیبی زوال اور اخلاقی بے حسی کو موضوع بنایا ہے۔ ان کے افسانے محض واقعات کی عکاسی نہیں کرتے بلکہ قاری کو اپنے معاشرتی

رویوں اور اخلاقی ذمہ داریوں پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کہانیوں میں انسان کی اصل آزمائش اس وقت سامنے آتی ہے جب اسے اختیار، خوف، مفاد اور ضمیر میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ یہی فکری گہرائی اس مجموعے کو جدید اردو افسانے میں اہمیت عطا کرتی ہے۔

حوالہ جات:

1. ناصر عباس نیر، "خاک کی مہک"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2016ء، ص24
2. ایضاً، ص46
3. ایضاً، ص65
4. ایضاً، ص66
5. ایضاً، ص68
6. ایضاً، ص91
7. ناصر عباس نیر، "راکھ سے لکھی گئی کتاب"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2018، ص14
8. ایضاً، ص20-21-22
9. ایضاً، ص32
10. ایضاً، ص39
11. ایضاً، ص44
12. ایضاً، ص88
13. ایضاً، ص92
14. ایضاً، ص104
15. ایضاً، ص121
16. ناصر عباس نیر، "فرشتہ نہیں آیا"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2017ء، ص16
17. ایضاً، ص58
18. ایضاً، ص133
19. ایضاً، ص138
20. ایضاً، ص165
21. ناصر عباس نیر، "ایک زمانہ ختم ہوا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2020ء، ص14

22. ایضاً، ص37

23. ایضاً، ص127